فکر و نظر........... اسلام آباد　　　جلد: ۴۶　شمارہ: ۲،۱

ہمارے شاہ صاحب☆، ☆☆

سیّد محمد ابوالخیر کشفی

اس سال کے آغاز میں یا گزشتہ سال کے اختتامی حصے میں، میں نے مغرب کی نماز حافظ سیّد فضل الرحمٰن کے دولت کدے ''الفضل'' میں ادا کی، ان کی بیٹھک میں قالینوں کا فرش ہے۔ اس شام کمرے میں ملگجی سی روشنی تھی یا شاید بجلی چلی گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں تیس سال پہلے زوار حسین شاہ صاحب کی بیٹھک میں موجود ہوں اور شاید یہی کمرہ ان کی نشست گاہ تھا مگر اس کمرے کی لمبائی چوڑائی ان کی نشست گاہ سے مختلف ہے اور میں جس کمرے میں حاضر ہوا تھا وہ قالینوں کا نہیں بلکہ سفید چاندنیوں کا فرش تھا، مگر وہ خاصا دبیز تھا، غالبًا سفید چاندنیوں کے نیچے قالین ہوں گے۔

چند ہی لمحوں میں، میں نے ماضی کا سفر طے کر لیا اور اس دوران مجھے وہاں شاہ صاحب کی موجودگی کا احساس ہوا۔ انسانی ذہن بھی کیا چیز ہے اور انسان حقیقت اور تخیل کے درمیان زندگی کیسے گزارتا ہے؟ نماز کے بعد میں نے عزیز الرحمٰن سلمہٗ سے پوچھا کہ کیا یہ ہی تمہارے دادا جان کا کمرہ ہے؟ اگر ہے تو اس کی لمبائی چوڑائی میں کیا فرق پیدا ہوا ہے؟ عزیز الرحمٰن نے بتایا کہ جی ہاں یہ دادا جان کا ہی کمرہ ہے ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ اس میں دیواری الماری بنائی گئی ہے جس کا اثر اس کی لمبائی پر پڑا ہے۔ اس جواب سے ہر بات روشن ہو گئی اور مجھے حضرت زوار حسین شاہ صاحب سے اپنی پہلی اور آخری ملاقات تفصیل سے یاد آ گئی، لیکن میں اس ملاقات کو بھولا ہی کب تھا، یوں سمجھئے کہ وہ ملاقات زندہ ہو کر سامنے آ گئی اور میں ایک بار پھر اس کیف سے گزرنے لگا۔ یہ یاد اس تجربے کی بازگشت بن گئی۔

میں نے جب تک زوار حسین شاہ صاحب کو نہیں دیکھا تھا تب بھی وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ وہ میرے ماحول میں رچ بس رہے تھے۔ میں انہیں اپنے گرد و پیش میں موجود پاتا۔ شاہ صاحب میرے استاد محترم حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کے مرشد تھے۔ میں ڈاکٹر صاحب

☆　حضرت سیّد زوار حسین شاہ صاحب

☆☆ ماہنامہ تعمیر افکار، کراچی، جنوری ۲۰۰۸ء، ہمارے شاہ صاحب

کی سادگی، ان کی للّٰہیت اور ان کی وضع فقر میں ان کے مرشد کو موجود پاتا۔ میرے دوست پروفیسر ڈاکٹر مفتی مظہر بقا صاحب بھی حلقہ زواریہ کے رکن تھے اور ایک طرح سے حضرت زوار حسین شاہ صاحب کے صاحبزادے حافظ فضل الرحمٰن صاحب کی اتالیقی کے منصب پر فائز تھے۔ وہ اکثر شاہ صاحب کے زہد و تقویٰ اور ان کی فقہی بصیرت کا تذکرہ کرتے۔ پھر میرے رفیق کار ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب مارٹن روڈ میں صوفی محمد احمد صاحب کے ساتھ رہتے تھے۔ صوفی صاحب بھی شاہ صاحب کی مومنانہ اداؤں کے اسیر تھے۔ ان کی باتیں بیان کیا کرتے تھے۔ پھر حضرت شاہ صاحب کی کتابوں کے تعارف نے ان کے خد و خال کو اور واضح کر دیا۔ میرا شروع سے یہ عقیدہ تھا کہ تصوف، جاہل پیروں فقیروں کی چیز نہیں بلکہ سلوک و معرفت کا یہ راستہ گہرے اور وسیع دینی علم کا تقاضا کرتا ہے۔ جو خود ہی منزل نہ جانتا ہو، وہ دوسروں کی راہ نمائی کیسے کر سکتا ہے۔ شاہ صاحب کا فقہی علم گہرے روحانی تجربوں سے ہم آمیز تھا، عمدۃ الفقہ میں نماز اور روزے کا جو بیان ہے اس سے ان عبادات کے فقہی پہلوؤں کا ہی علم نہیں ہوتا بلکہ ان کے روحانی مفاہیم بھی ہم پر آشکار ہوتے ہیں۔ محدث کبیر مولانا عبدالرشید نعمانی جب بھی حج یا عمرہ کے لیے تشریف لے جاتے تو وہ حضرت زوار حسین شاہ صاحب کی ''کتاب الحج'' کا ضرور مطالعہ کرتے۔ میں ان سے اکثر پوچھتا کہ آخر کیوں؟ تو جواب دیتے کہ عالم بھی فقہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا اور یہ کتاب اپنے موضوع پر اُردو میں بے مثال ہے۔

ایک دن مولانا نے فرمایا کہ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیے۔ اس پر میں نے مولانا مظہر بقا سے کہا کہ وہ حضرت شاہ صاحب سے وقت لے لیں اور ہمیں ان کی خدمت میں لے چلیں۔ ایک دن بقا صاحب نے کہا کہ کل شاہ صاحب کے پاس چلنا ہے۔ میرے ذہن میں اس عرصے میں کئی باتیں آئیں کہ جب میں ملوں گا تو شاہ صاحب سے یہ پوچھوں گا۔ ان کی کتاب ''عمدۃ السلوک'' میں تصوف کے مختلف سلسلوں کا ذکر ہے اور سلسلہ نقشبندیہ کے باب میں وہ ریاضتیں بھی درج ہیں جن سے راہِ سلوک کے مسافر کو اپنے شیخ کی نگرانی میں گزرنا ہوتا ہے۔

میرے ذہن میں بنیادی سوال یہ ہی تھا کہ پیری مریدی کیوں؟ کیا انسان یقین، اخلاص اور احسان کو خود اپنی خلوت کے ذکر و اذکار اور عبادت کے ذریعے حاصل نہیں کر سکتا؟ اور تصور شیخ کیوں؟ کیا آدمی رسول اللہ ﷺ کی محبت کو اپنا کر اور ان کے اسوہ حسنہ کی پابندی کر کے یہ منازل طے نہیں کر سکتا؟ ان سوالات کے علاوہ ملک کے سیاسی حالات بھی بہت پریشان کر رہے تھے، قوم انتخابات کو مسترد کر چکی تھی اور بھٹو صاحب کے خلاف شدید تحریک اپنے فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوا چاہتی تھی۔ میں شاہ صاحب سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر ہوگا کیا؟ ان کی بصیرت کیا دیکھ رہی ہے؟

ہم مقررہ شام مولانا مظہر بقا کی معیت میں مولانا سیّد زوار حسین شاہ صاحب کے گھر حاضر ہوئے (مولانا نعمانی اور راقم الحروف) شاہ صاحب نے اپنے کمرے کے دروازے تک آ کر ہمارا استقبال کیا اور مولانا نعمانی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے نشست تک آئے۔ ہم لوگ بیٹھ گئے اور رسمی کلمات کا تبادلہ ہوا۔ شاہ صاحب سفید قمیص اور شلوار میں ملبوس تھے۔ ان کے مخاطب مولانا نعمانی تھے۔ شروع میں ان بزرگوں نے غالبًا علم حدیث پر گفتگو کی اور پھر گفتگو کرتے ہوئے شاہ صاحب اٹھے اور ایک گاؤ تکیہ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے میری طرف بڑھے اور میری پشت سے لگا کر وہ تکیہ رکھ دیا۔ مولانا نعمانی کی پشت پر پہلے ہی ایک تکیہ رکھا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ بہت سادگی اور بے اختیاری کے ساتھ ہوا، شاہ صاحب کی اس سادگی میں وہ کیفیت بھی تھی جسے اس وقت بھی میں نے دل ہی دل میں بدویت کہا تھا اور آج تک اس سے بہتر کوئی لفظ میرے ذہن میں نہیں آتا۔ مولانا نعمانی سے شاہ صاحب کی گفتگو کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا اور پھر مولانا نے کتاب الحج کی تعریف کی اور یہ بھی فرمایا کہ اس کا ایک خلاصہ بھی ضروری ہے تاکہ افادے کا سلسلہ وسیع تر ہو سکے۔ شاہ صاحب نے کہا کہ میں خود بھی اس کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں مگر مصروفیات کچھ ایسی ہیں کہ وقت نہیں نکل سکا۔

پھر نہ جانے تصوف کا ذکر کیسے چل نکلا۔ میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ آج تصوف رسم زیادہ ہے اور حقیقت کم، مرید اپنے پیر کا ذکر زیادہ کرتے ہیں۔ ان کے معمولات، وظائف اور کرامتیں بیان کرتے ہیں لیکن رسول اللہ ﷺ کے اسوہ حسنہ اور اتباعِ سنت کا ذکر نہیں ہوتا۔ شاہ صاحب میری طرف متوجہ ہوئے اور پھر خاصی دیر گفتگو فرمائی۔ کہنے لگے کہ آج تصوف تزکیہ نفس کی بجائے رسمی پیری مریدی کا سلسلہ بن گیا ہے۔ اس کا سبب جہل ہے۔ پہلے بہت سے لوگ خواندہ نہیں ہوتے تھے لیکن اچھے علماء کی صحبت میں بیٹھ کر ضروری حد تک علم دین سیکھ لیتے تھے۔ انہیں یہ خبر تھی کہ بیعت رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے اور آپ ﷺ نے کئی اہم موقعوں پر صحابہ کرامؓ سے بیعت لی۔ بیعت دراصل نام ہے اپنے نفس کو اللہ کی رضا کے لیے بیچ دینے کا۔ آج مرشد اپنے مرید سے اس بات کی بیعت لیتا ہے کہ وہ کبیرہ گناہوں سے بچے گا اور فرائض دینی بجا لائے گا۔ بیعت کے ذریعے آدمی کا تعلق اہل اللہ سے قائم رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ فاتحہ میں یہ نہیں فرمایا کہ اهدنا الصراط (القرآن) بلکہ فرمایا کہ ہمیں ان کے راستے پر چلا جن پر تو نے انعام فرمایا اور رب العزت نے یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ الحمدللہ اس امت کی تاریخ

کے ہر دور میں اور ہر ملک میں اور ہر بستی میں اللہ کے صالح بندے ضرور موجود رہے ہیں۔ یہی لوگ دنیا کی روشنی ہیں۔ یہ نہ ہوں تو نظامِ ہستی درہم برہم ہو جائے۔

میں جب گھر سے نکلا تھا تو یہ سوالات میرے ذہن میں بار بار آ رہے تھے۔ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ جب شاہ صاحب سے ملنے کی نیت کی تھی تو ان سوالات نے ذہن میں ڈیرا ڈال دیا تھا، لیکن اس ملاقات میں یہ سوالات میرے لبوں تک نہ آئے اور شاہ صاحب نے کیسے میرے دل کی بات جان لی۔ صوفیوں اور اولیاء اللہ کے تذکروں میں شدید عبادتوں کا ذکر بھی مجھے پریشان رکھتا تھا۔ دریا میں پیر لٹکا کر یا دریا میں کھڑے ہو کر وظیفے پڑھنا، جنگلوں میں رہائش، ہفتوں کچھ نہ کھانا جس میں جان کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو، پتہ نہیں میں نے یہ بات چھیڑی یا شاہ صاحب نے خود فرمایا کہ ایسی ریاضتوں کا تذکرہ تذکرہ نگاروں نے کچھ تو پڑھ کر پیش کیا اور بنیادی بات یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی صحبت بھی صحابہ کرام کے تزکیہ نفس اور تربیت کے لیے کافی تھی اور اس کا کوئی بدل ممکن نہیں۔ پھر صحابہ کرامؓ کی زندگی میں کتنے آزمائشیں آئیں، جہاد کے جیسے مواقع آئے، ترغیبات نے کس کس طرح ان کے راستے کو مشکل بنایا ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ یہی وہ لمحہ تھا جب مرشد اور رہنما کی اہمیت اور بیعت کی ضرورت کا احساس میرے دل میں جاگا۔ ورنہ میں اسے ایک رسم سمجھتا تھا، ایک ایسی رسم جن میں کوئی افادیت باقی نہیں رہی تھی، میں نے چاہا کہ شاہ صاحب سے بیعت ہو جاؤں لیکن سوچا کہ شاہ صاحب اور اس ملاقات کے ساتھی میرے اس فیصلے کو جذباتی اور عاجلانہ قرار دیں گے اس لیے میں نے اس خواہش کا اظہار نہ کیا اور ادھر مغرب کی اذان کی آواز کانوں میں آئی اور ہم نماز کی تیاری میں لگ گئے لیکن اس ملاقات کے اثرات میرے دل پر قائم رہے اور میں نے دو تین سال بعد حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی نوراللہ مرقدہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ بھی حسن اتفاق تھا کہ اس موقع پر بھی حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی میرے ساتھ تھے، وہ اگرچہ حضرت رائے پوریؒ سے بیعت تھے مگر انہوں نے بھی علی میاں کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی۔

جب مغرب کی نماز کے لیے جائے نمازیں بچھ گئیں تو حضرت شاہ صاحب نے مولانا نعمانی سے کہا آپ نماز پڑھائیں۔ مولانا نے کہا یہ آپ کا علاقۂ اثر ہے، ویسے بھی حدیث کے مطابق آدمی کو اپنے گھر میں امامت کرنی چاہیے، حضرت شاہ صاحب مسکرائے اور فرمایا آپ علم حدیث سے فائدہ اٹھانا خوب جانتے ہیں، اس پر نعمانی صاحب نے کہا دراصل ہم آپ کی اقتدا کا فیض حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ شاہ صاحب نے نماز پڑھائی اور بعد نماز ہم پھر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

اس اثناء میں چائے مع دیگر لوازمات کے ساتھ آ گئی۔ پتہ چلا کہ شاہ صاحب کے علم کے ساتھ آپ کا دسترخوان بھی وسیع تھا۔ میں نے عرض کیا آپ نے بہت تکلف فرمایا۔ جواب ملا ایسی بات نہیں یہ مہمان کا اکرام ہے۔ پھر شاہ صاحب مولانا نعمانی سے حدیث اور علم حدیث پر گفتگو کرنے لگے۔ انہوں نے نعمانی صاحب کی کتاب ''ابن ماجہ اور علم حدیث'' کی بہت تعریف کی اور کہا یہ کتاب دراصل تین کتابوں کا مجموعہ ہے، تاریخ حدیث، علم حدیث اور ابن ماجہ اس کو اگر اس طور پر مرتب کیا جائے کہ یہ تینوں موضوعات الگ الگ کتابوں کی بنیاد بنیں اور مزید مباحث شامل کر دیے جائیں تو بہت مفید ہوگا۔ مولانا نعمانی نے شاہ صاحب کی بات سے اتفاق کیا۔

یہ گفتگو ختم ہوئی تھی کہ میں نے شاہ صاحب سے کہا کہ موجودہ سیاسی حالات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے، واقعات و حالات کیا کروٹ لیں گے؟ بھٹو صاحب عوامی احتجاج کے سامنے ہتھیار ڈالیں گے؟ اور پھر انتخابات ہوں گے؟ شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ ہمیں مستقبل کے بارے میں کچھ نظر نہیں آتا اور سچ پوچھیے تو اس کا تعلق مشیت الٰہی اور ہمارے عمل سے ہے۔ یہ فیصلہ بھٹو اور سیاسی لیڈر مل کر کریں تو بحران ختم ہو سکتا ہے ورنہ ایوب خان کی طرح کوئی دوسرا فوجی ملک پر قابض ہو جائے گا۔ تقدیر سے ہم واقف نہیں مگر ایسے حالات میں ہمارے عمل پر تقدیر کا انحصار ہوتا ہے۔

اب خاصی دیر ہو چکی تھی اور عشاء کا وقت قریب تھا، ہم لوگوں نے شاہ صاحب سے رخصت کی اجازت لی، شاہ صاحب نے مجھے اور مولانا نعمانی کو خوشبو اور قلم کے تحفوں سے نوازا اور جب ہم لوگ شاہ صاحب سے مل کر رخصت ہوئے تو سڑک پر بجلی کے قمقمے ہمیں دوسری شاموں سے زیادہ روشن نظر آئے۔

☆☆☆☆☆